TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222256
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳۳ Accession No. ۱۱۹۸۹

Author ر - س رشید النجری

11989

Title سوکن کا جلاپا

This book should be returned on or before the date last marked below.

جملہ حقوق محفوظ

سوکن کا جلاپا

یعنی

ناشاد و نامراد محمودہ کا افسانۂ غم

مصنفہ

مصورِ غم جناب مولانا راشد الخیری صاحب دہلوی

مصنف صبح زندگی ۔ شام زندگی
شب زندگی ۔ منازل السائرہ وغیرہ

سنہ ۱۹۳۰ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار پنجم

تمہید

میاں ذاکر کا دوسرا نکاح بچشم ما روشن دل ما شاد۔ نئی دلہن کا سہاگ آنکھوں سکھ۔ کلیجے ٹھنڈک۔ واسطہ نہ غرض۔ آس نہ پاس۔ ہم اعتراض کرنے والے کون؟ ذمہ دار ہیں تو میر شریف اور گنہگار ہیں تو بی گمانی۔ سگے ماموں ممانی اور یہ اندھیر کہ بھانجی بدنصیب پر سوکن تک لا بٹھائی اور پھر بھی پیٹ نہ بھرا۔ قرنوں نہ برسوں۔ ڈیڑھ پونے دو برس کی بات ہے بی بی گمانی جو آج کانوں پر ہاتھ دھر گئیں۔ بات ٹھہرنے سے پہلے آدھی آدھی رات تک بیٹھی خوشامد کرتیں جس نند کے آگے ہاتھ جوڑے۔ اس کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی۔ ایسی فرنٹ ہوئیں کہ بیگم کو لونڈی کیا زندہ کو مردہ بنایا مگر صد آفرین محمودہ کو۔ میاں چھنا گھر گیا۔ لیکن بچوں کی شرم۔ باپ دادا کی لاج ایسی رکھی کہ کنبہ بھر میں نام کر گئی۔ اسی سہاگن کا دل تھا کہ جس سیج پر مکھی تک بیٹھنی گوارا نہیں۔ وہ آناً فاناً بالکل برباد ہو جائے۔ مگر کیا مجال کہ زبان سے اف تک کی ہو۔

ہمیں اگر شکایت ہے تو نصیرہ سے! رشتہ ناتا میل جول سب پر خاک ڈال ایسی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی کہ الٰہی توبہ۔ کم بخت نمازی پرہیزگار ہوشیار سمجھ دار۔ ایک چھوڑ تین تین لڑکیاں آگے۔ بیٹی دے سگی خالہ زاد بہن کا گھر بالکل تاراج کر دیا۔ بڑوں کی کیا کمی۔ اوپر سو پر جلدی یاد پڑ۔ امیر یا غریب جیسا نصیبے میں ہوتا مل ہی جاتا یا اتنے بڑے غدار شہر میں ایک مظلومہ ہی کا خاوند رہ گیا تھا؟ خلق کا حلق بند نہیں ہو سکتا۔ وہ مر گئی اور ہم کو مرنا ہے اتنا ضرور کہیں گے۔ دکھیاری نصیب ماری شاکرہ کی جان محمودہ بے زبان اس کٹر ساس کے ہاتھوں جس حسرت سے رخصت ہوئی۔ ایسی موت خدا دشمن کو بھی نہ دے۔

یہ بی گمانی ہی کی عنایت تھی کہ وہ اللہ آمین کی بچی جس کے پاؤں کے نیچے ماں اور باپ دونوں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس طرح مری کہ کوئی حلق میں پانی ٹپکانے والا نہ تھا۔ غضب خدا کا ممانی کی ممانی۔ ساس کی ساس اور اس قدر سنگدل کہ آخیر وقت بھی پاس آکر نہ پھٹکی۔ کچھ ایسی بہو کے نام کی جلنوائی پڑی کہ غریب مرتے مر گئی اور چل جو گئی۔ آکر جھانکی تک نہیں۔ وہ تو خدا بچاری بستی کا بھلا کرے کہ کہیں پھرتی پھراتی آنکلیں۔ تو اپنا کھیس اڑھا پردہ ڈھانک دیا۔ ورنہ گمانی کا بس چلتا تو شاید مردے کو کفن بھی نصیب نہ ہوتا۔

ہم کو گمانی کے معزز اور مالدار ہونے سے انکار نہیں۔ مگر اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ ان گنوں نے ساری شرافت غارت کر دی؟ محمودہ آئی گئی نہ تھی۔ بیچوں کی بیاہی۔ منتوں کی لائی۔ میاں پلے پر نہ تھا تو نہ ہو۔ انسانیت کے معنی یہ تھے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر لائی تھی۔ کلیجے سے لگا کر رکھی۔ نری ساس ہی نہیں ممانی بھی تو تھی۔ ڈوب مرے وہ ساس۔ ساٹھ بینسٹھ برس کی بڑھیا۔ قبر

میں پاؤں ۔ نواسا نواسی ۔ پوتا پوتی اور سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی اور بہو غریب برس دن کی بیاہی ۔ پہلونٹی کا بچہ گود میں ۔ پہننے اوڑھنے کے دن ۔ بے فکری کا زمانہ اور چاندی کا تار تک نہیں ۔ میاں بیزار ۔ ساس سے جوتی پیزار ۔ ہو کہاں سے اور بناوے کون ؟ میکے سے ملا سب کچھ مگر ایسی منحوس گھڑی کا کہ سال کے اندر ہی اندر دھڑی دھڑی کر کے لٹا ۔

سچ پوچھو تو اس کا دل آپ ہی ایسا مر گیا تھا کہ ارمان اور اُمنگ کچھ بھی نہ رہا ۔ وُہ ساس سے دولت و حشمت کی طلبگار نہ تھی ۔ اِس بیچاری کو تو سیدھے مُنہ بات کر لینا بھی بہت تھا ۔ مگر کم بخت اس کو بھی ترستی ہوئی سدھار دی ۔ جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں ۔ بیماری کی کٹھن گھڑیاں ۔ اکیلی ٹرڈوں ٹوں پڑی اللہ کی قدرت دیکھتی ۔ تیمارداری تو درکنار ۔ کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ جھوٹ موٹ آ کر بات پوچھ لے ۔ رات ۔ سر پر خدا کی ذات ۔ آدمی نہ آدم زاد ۔ کہاں کی دوائی کیسی ٹھنڈائی ۔ ماں نہیں باپ نہیں ۔ ادھی پاس نہیں ۔ کریں تو ساس نہ کریں تو ساس ۔ اُن کا یہ حال بڑے دالان میں پردے ڈال ۔ زردے پر زردہ اور پان پر پان ۔

غیر بی گمانی نے جیسا کیا ۔ وہ جانیں اُن کا کام ۔ آج نہیں کل ۔ کل نہیں پرسوں اب نہیں کبھی ۔ یہاں نہیں وہاں ۔ ایک دن ایسا آنا اور ضرور آنا کہ محمودہ کی فریاد حاکم حقیقی کے دربار سے چپ کی داد لیتی ۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے ۔ دُکھے ہوئے دل کی آہ اُوپر ہی اُوپر جانے والی نہیں ! محمودہ کو مرے پورے چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ نندوئی نے دھڑتے سے دُوسرا نکاح کیا اور وہی سلطانہ جس پر بی گمانی دیوانی اور میر شریف پروانہ تھے ۔ باجے گاجے سے سوکن لا بٹھائی ۔ ساس کی عداوت اور اس چھوٹی نند سلطانہ کی شرارت سے جو کچھ ہوا ۔ خیر محمودہ تو

کلیجہ مسوس کر رہ گئی - مگر اس کا صبر خالی نہ گیا - دونوں ماں بیٹیوں نے جیسا کیا۔ اپنی گود میں پا لیا - اس کی تقدیر میں تو پانچ چھ ہی مہینے کی سوغنی تھی - جس طرح ہوا دن پورے کئے - مگر بی سلطانہ عمر کیسی برباد ہوئی + لونڈی کی بھی آبرو زیادہ ہوگی - جو اس کی میاں اور سوکن کے گھر میں تھی - میر شریف اور بی لگانی دونوں نے بہیترا ہی سر ٹپکا اور ہاتھ پاؤں مارے مگر سوکن نے بھی ایسا شکنجہ میں کسا کہ تل بھر سر کنے نہ دیا۔

سلطانہ کے اُوپر اگر سچ پوچھو تو کچھ خدا ہی کا غضب ٹوٹا - کس کو خبر تھی - کہ یہ میاں جو دم بھر کے واسطے بھی بیوی کو آنکھ سے اوجھل نہ کرے - ایسا پلٹ جائے گا کہ سوکن اور سوکن کی ماما ئیں تک مُنہ بھر کے کوسنے دیں - اور یہ چپکا بیٹھا سُنتا رہے اور سلطانہ جو آج بیٹھی راج کر رہی ہے دو دو دانوں کی محتاج ہو جائیگی۔

مسئلہ تقدیر صحیح ہو یا غلط - اس سے بحث نہیں - مگر اتنا تو آنکھ سے دیکھ لیا کہ سلطانہ کے اِس انقلاب پر ایک دو نہیں کنبہ بھر پکار اُٹھا ؎

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

رہے میاں ذاکر - اللہ امین کے لال - اماں باوا کے چہیتے - ایسے بلند اقبال - جس قدر بدتمیز نہ ہوتے - تھوڑے - گھر اور مسجد مکتب اور مدرسہ سب ہی جگہ کی خاک اُڑائی - مگر رہے ٹھوٹ کے ٹھوٹ - کم بخت کچھ ایسا بے مغز واقع ہوا تھا کہ میر شریف مرحوم نے اپنے جیسا کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی - قرآن پڑھایا - حدیث دکھائی - خود تکلیف اُٹھا کر اس کے واسطے دو دو استاد نوکر رکھے - مگر اللہ رے وضعداری اور قول کا پاس سات دفعہ انٹرنیس امتحان میں شریک ہوئے مگر جب گیا فیل - پھر بھی میر صاحب اُن کی ارواح نہ

شرمائے۔ بیٹے کو ہمیشہ عالم ہی سمجھتے رہے۔ خیر وہ عالم تھا یا فاضل جیسا بھی تھا وہ جانے۔ مگر ہاں اتنا ہم بھی کہیں گے کہ آدمی نہیں جانور بلکہ جانور سے بھی بدتر تھا۔ ایک ایسے پھول کو جس میں رنگ اور خوشبو دونوں چیزیں موجود تھیں محض اپنا دل خوش کرنے کے واسطے پاؤں سے مسل دیا ؂

محمودہ جیسی وفادار اور خدمتگذار بیوی کہ جس کے برائے نام بخار پر بھی ماں باپ نے بکرے مانے اور ملاّ نے کھلائے۔ اس کی سزاوار نہ تھی کہ دم واپسین سینے میں ہو۔ رات کا سناٹا۔ اندھیرا گھپ اور چراغ تک نصیب نہیں۔ محمودہ دنیائے ناپائدار کو خیرباد کہے اور ڈاکرجفا کار رو بوانہ بیج بیٹھا ٹھٹھے اڑائے ؂

کاش بدنصیب محمودہ خدمت و وفاداری میں کسی قسم کی کمی کر دیتی تو ہم کو صبر آجاتا۔ مگر وہ مصیبت کی ماری میاں ہی کا کلمہ پڑھتے مری۔ کھانا پانی دوائی ٹھنڈائی کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ مگر ہاں یہ ارمان دل میں تھا اور افسوس! اس ارمان کو اپنی جان کے ساتھ لے گئی کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ خاوند کے قدموں پر گر کر قصور معاف کرالوں" ؂

محمودہ ختم ہو چکی۔ اس کی ہڈیاں تک گل کر خاک ہو گئیں۔ مگر اس کا افسانہ باقی ہے اور رہے گا۔ انصاف کی آنکھیں اس کے صبر پر رحم کے آنسو روئینگی۔ کہ یہ فانی ڈیرا۔ جس کی کل بساط چڑیاں رین بسیرا۔ کیسے کیسے تماشے دکھا رہا ہے اور یہی انسان اسی زمین پر اسی آسمان کے نیچے کیا کیا ظلم و ستم کر رہا ہے موت کا بازار گرم۔ عدم آباد کا راستہ درپیش۔ عزیزوں کا فراق۔ دوستوں کی رخصت۔ یہ تمام سامان روبرو ہے۔ برابر کے ساتھی۔ سنگ کی سہیلیاں۔ چھوٹے اور ایسے چھوٹے کہ آنکھیں اُن کی صورت کو ترس گئیں۔ دل ناشاد

ان کی جدائی پرخون رو رہا ہے اور روتا رہے گا۔ مگر وہ عزیزوں کے عزیز۔ پیاروں کے پیارے۔ کلیجے کے ٹکڑے۔ آنکھوں کے تارے۔ مٹی کے ڈھیر میں میٹھی نیند پڑے سوتے ہیں۔ آہ ری فانی دُنیا تیری لذّتیں کڑوی۔ تیری خوشیاں جھوٹی۔ تیرے داغوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ وہ گوہر آبدار جو کل تک آنکھوں کے سامنے چمک دمک رہے تھے۔ آج کہاں ہیں! گہری گور۔ اور جنگل بیابان! بیہوشی کی نیند اور ہو کا میدان ؛

کیوں ؟ نیند کے متوالو! آخر حیات مستعار دھوکا دے گئی۔ دُنیا ختم ہو چکی وہ رونق اور چہل پہل یہیں کی یہیں رہی۔ اب اکیلے تن تنہا ہو مگر نہیں نہیں تم خالی ہاتھ نہیں ہو۔ تمہارے عمل تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری کھیتی باڑی تمہارے پاس ؛

ناشاد و نامراد محمودہ تو جل جل کر مری اور گھل گھل کر گئی۔ خدا کا وعدہ سچا۔ یوم الحساب برحق۔ اب اس دن کا انتظار کر جب ایک زبردست بادشاہ کا دربار ہو۔ تیرا ظالم خاوند تیرے سامنے ہو گا اور دل مجروح کی فریاد حاکم حقیقی کے پاس ؛

حیات ناپائدار پر جان چھڑکنے والو! کس برتے پر تتا پانی اور کے دن کی پر یہ شوں شاں ؟ خدا کا معاملہ خدا کے ساتھ۔ تم جانو اور وہ۔ مگر انسانیت یہ ہے۔ جیو تو اس طرح کہ لوگ آنکھوں پر بٹھائیں اور مرو تو یوں کہ اپنے تو اپنے غیر بھی عمر بھر روئیں ؛

(۱)

تقدیر یا اتفاق جو کچھ بھی ہو اچنبھا ضرور تھا۔ وہی نشاکر جو فاکریں ہزاروں کیڑے ڈالتی تھی۔ بیٹی دینے پر راضی ہو گئی۔ یہ صحیح کہ وہ پھوپھی کے سامنے

چھوٹے سے بڑا ہوا - پلا - بڑھا - اس کی طبیعت - مزاج - خو - بو - عادت خصلت سب سے اچھی طرح واقف تھی - مگر یہ کون مان لے گا کہ اس نے جان بوجھ کر محمودہ کو کنوئیں میں دھکیل دیا؟ ماں تھی - دشمن نہ تھی - پیٹ میں رکھا - دودھ پلایا - پالا - پوسا - چودہ برس کی محبت اس دن کے لئے نہ تھی کہ محمودہ جیسی بیٹی کا ہاتھ ذاکر جیسے بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا - زیادہ سے زیادہ یہی کہو کہ تقدیر کا لکھا - ہونی - شدنی - ادھر بھائی کی لچھے دار تقریر - بھاوج کے بڑھیے - آنکھوں پر پردے پڑ گئے - خدا کو جان دینی ہے - محمودہ کے معاملہ میں شاکرہ بالکل بے گناہ ہے وہ تو خیر عورت تھی - ناقص العقل تھی - مرزا صاحب مرد اور عقلمند مشہور رہتے مگر گمانی کے جال میں ایسے پھنسے کہ نکلنا تو درکنار پھڑ پھڑائے تک نہیں - گو شاکرہ اس وقت موجود نہیں - مگر سچ یہ ہے کہ وہ ذاکر کا نام سنتے ہی پیغام سے بارہ اور بارہ چوبیس کوس الگ ہو گئیں لیکن گمانی کیا چوکنے والی بشر تھیں - چار دن کا غوطہ دے کر پانچویں دن رات کے نو بجے ہوں گے - بہن بھائیوں کا گھر ملا ہوا تو تھا ہی - کھڑکی کھول نند نندوئی کے سر پر آ دھمکی - کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کرا وہی مرغ کی ایک ٹانگ "بوا محمودہ تو میری ہے"۔

نند - "بھابی - میں تو کہہ چکی - غریبوں کی قسمت غریبوں ہی میں ٹھیک ہوتی ہوتی ہے - کیوں گھڑی گھڑی کہہ کر شرمندہ کرتی ہو - اللہ ذاکر کی عمر دراز کرے اس کو بیبیوں کی کیا کمی؟ تمہارے کہنے کی دیر ہے لوگ تو چوم چاٹ کر دیں گے - ایک ذرا مزاج تیز ہے - سو آج کل کے لڑکوں کا سبھی کا ہوتا ہے - لڑکی بردبار ہونی چاہیئے - محمودہ کو تو تم جانتی ہو - تمہارے نندوئی بیٹھے ہیں - پرسوں فقط اتنا کہا تھا - بیٹی آنکھ بند کر کے پان بناتی ہو - زبان کے

ٹکڑے اُڑ گئے ۔ بھابی! خدا کی قسم ۔ لڑکی سوچ کر کپا ہو گئی ۔ کچھ ایسا مزاج ہے
کہ دیکھا نہ سُنا ۔ یقین جانا کہ جوڑ ٹھیک نہیں ۔ یہ اس سے زیادہ ۔ وہ اس
سے ۔ اِدھر یہ تیز اُدھر وہ ۔ گذر ہو تو کیونکر ؟

بھاوج ۔ ذاکر کا مزاج گندہ ہے تو ہوا کرے ۔ محمودہ کے ناز اُٹھانے
والی میں کیسی بیٹھی ہوں ۔ مجال ہے کہ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے ۔ شریفوں کی زبان
ایک ہوتی ہے اور میری عادت سے تو تم واقف ہی ہو ۔ چاہے دنیا اِدھر کی
اُدھر ہو جائے ۔ مگر جو بات نکل گئی وہ پتھر کی لکیر ۔ میں محمودہ کی دشمن تو نہیں ہوں
لو! میرے تمہارے بیچ میں خدا ہے ۔ اگر اس کو تکلیف ہو جائے تو میری قبر اور
حشر میں ۔

قول اور قرار قسمیں اور وعدے ۔ مختصر یہ کہ ایک قرآن تو نہیں اُٹھایا
ورنہ جو جو کہہ سکتی تھی کہہ ڈالا اور کر سکتی تھی کر ڈالا ۔ میرزا جیسے بھولے بھالے جو
لفظ سلیح کی زبان سے نکلا ۔ قرآن اور حدیث تھا ۔ جھٹ پٹ راضی ہو ہوا ۔
تاریخ مقرر کر دی ۔

شاکر کا یہ عذر ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں کہ میں میاں سے مجبور ہو
گئی ۔ بیٹی کا معاملہ ۔ میاں بیوی دونوں برابر کے شریک ۔ اور پھر میرزا جیسے
میاں کی چل جائے ۔ اس کی زبان جو ۲۵ - ۲۶ برس میں بیوی پہ بگڑنا اور گھرکنا
تو در کنار "دھتے سے مُنہ" بھی کہا ہو ۔ قیاس میں نہیں آتا کہ شاکرہ چاہتی نہ ہو
اور میرزا بیوی کی مرضی کے خلاف نکاح کر دیتا ۔ اس غریب نے ایک دفعہ بھی
نہیں بار رہا اور چپ چپاتے نہیں گھر بھر کے سامنے کہہ دیا "کرنے دھرنے والی
یہ بیٹھی ہیں ۔ بھائی اِن کا ۔ بھاوج ان کی ۔ بھتیجا ان کا ۔ بیٹی اِن کی ۔ میں تو ان
کی رضامندی پر راضی ہوں" ۔

غرض بات تھی ہونی۔ نکاح تھا بندھنا۔ میاں بیوی دونوں کا مُنہ کھل گیا اور محمودہ بدنصیب ماں کے آغوش سے نکل کر ذاکر کے پنجہ میں جا پھنسی +

(۲)

سُنا تو یہ تھا کہ جیتی مکھی نگلی نہیں جاتی۔ دیکھا یہ کہ محمودہ کی ماں شاکرہ جیتی کیسی۔ خاصی اچھی اُڑتی اور پھڑ پھڑاتی مکھی صاف چٹ کر گئی۔ دوراندیشی۔ انجام بینی سب پر خاک ڈالو۔ یہ تو موٹی سی بات تھی کہ محمودہ جیسی لڑکی وہ تنک مزاج اور ضدان کہ خفگی اور گھرکی تو درکنار۔ جو کہیں جھوٹ موٹ سے بھی ماں ذرا تیز آواز سے بولی۔ تو مزاج کہیں کا کہیں پہنچا۔ پھر قدری کر ڈالو۔ گھڑیوں اور گھنٹوں۔ دنوں اور مہینوں اس کے دل سے بات جانے والی نہیں۔ اس کے واسطے ذاکر جیسا لڑکا کہ اپنا مطلب ہو تو گدھے تک کو باپ بنالے۔ دوسرے کی غرض ہو تو آدمی مرتے مرجائے۔ حلق میں پانی تک ڈالنا حرام۔ محمودہ کی انسانیت یہ کچھ کہ آپ بھوکی رہے تو بلا سے۔ عزیزوں کے واسطے کھانا تو کھانا جان تک قربان۔ ذاکر کی بھلمنساہٹ وہ کچھ کہ چھوٹا بھائی روتے کا روتا رہ جائے اور خربوزے کی پھانک اس کے ہاتھ سے چھین کر منہ پھیڑ کار گئے۔ میر شریف۔ گمانی۔ شاکرہ میرزا صاحب اِن چار بندوں میں سے جس کو چاہے قصوروا سمجھ لو۔ محمودہ اور ذاکر کا نکاح ہماری رائے میں تو آگ پر باروت تھی۔ نزلہ عضوِ ضعیف پر۔ محمودہ عورت ذات۔ گرا تو ایسا گرا کہ جان ہی لے کر ٹلا +

دوسرا یا تیسرا چالا ہوگا۔ صاحب خانہ یعنی خالہ نے گیارہ روپے داماد کو دیئے اور ڈیڑھ سو روپے کا گلوبند بھانجی کو۔ عقل کا دشمن اتنا نہ سمجھا کہ گمی کہاں گیا۔ کھچڑی میں۔ سوچا یہ کہ بیٹی کو ڈیڑھ سو اور مجھ کو نقد گیارہ +

یہ تھا پہلا رنج جو اِس قصّے کی جان ذاکر بے ایمان کو بیوی اور بیوی کے

رشتہ داروں سے پہنچا۔

ذاکر تو خیر بچہ تھا۔ ناتجربہ کار تھا۔ افسوس تو اُس درجن بھر بچوں کی ماں گمانی پر ہے۔ سوچا نہ سمجھا۔ تڑ سے بہو کے مُنہ پر کہہ دیا۔ بہو بھی آخر گری پڑی نہ تھی۔ بہو۔ منت خوشامد کی بہو۔ اللہ آمین کی بہو۔ ساس کے تیور بدلے۔ میاں کا رُخ پلٹا دیکھ صبح ہوتے ہی گلوبند گلے سے کھول میاں کے آگے رکھ کہنے لگی "میں بھی تمہاری۔ زیور بھی تمہارا۔ میاں بیوی کی چیز جُدا کیسی چولھے میں جائے وہ گلوبند جس کی وجہ سے تم ناخوش ہو۔ اماں جان رنجیدہ۔

میاں - ایسی باتیں ہم بھی خوب سمجھتے ہیں۔ چولھے میں جائے یا بھاڑ میں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

گلوبند کا غبار ابھی دل سے نہ گیا تھا۔ کہ ایک اور واردات پیش آئی + رات کا وقت تھا۔ آٹھ بجے کی توپ چھوٹ چکی تھی۔ ذاکر کے کوئی دوست ملنے آئے۔ پانوں کی ضرورت ہوئی۔ ماما کو کہا۔ پان دے جا۔ سنتیں یا نفل ہوتے تو محمودہ سے یہ بھی بعید نہ تھا۔ کہ نماز چھوڑ نیت توڑ حکم کی تعمیل فوراً کرتی ستم یہ ہوا کہ فرضوں کی نیت باندھ لی تھی۔ ماما نا بکار کہنے کو مسلمان سچ مچ کی بے ایمان۔ جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر ایسی انجان بنی۔ گویا خبر ہی نہیں۔ گرمی کے دن۔ بیچ انگنائی کا معاملہ۔ چاندنی کھلی ہوئی۔ بجلی کا لیمپ دھڑ دھڑ جل رہا۔ اندھی نہیں۔ دیوانی نہیں۔ مگر اُسے تو بی گمانی کو خوش کرنا تھا۔ چوکی پاس آ اپنے ہی مُنہ میں منن منن کر پانوں کو کہہ چلتی ہوئی۔ ساس پٹاری کھولے پان بیٹھی کھا رہی تھی۔ کچھ گناہ نہ تھا۔ اگر دو تین باہر بھیج دیتیں۔ لیکن کیوں بھیجتیں۔ ذمہ دار تو بیوی تھی۔ ماں سے واسطہ کیا؟

پانوں کو ہوئی دیر۔ دوست ہوئے چلنے کو تیار۔ ذاکر ہیں کہ آواز دل

پرآواز۔ تقاضے پر تقاضا۔ میاں کی چیخ پکار سُن بیوی غریب کے ہاتھ پاؤں
پھول گئے۔ آدھی پاؤ۔ اونی پونی نماز پڑھ پڑھا۔ جب تک سلام پھیرے
وہ دوست رخصت اور میاں چیختے ہنکارتے سر پر موجود:۔

غصّہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ بیوی بیچاری اتنی سیدھی اور بھولی
کہ جانماز پر بیٹھی اوٹ آگے رکھے قسموں پر قسمیں کھا رہی ہے اور میاں کمبخت
ایسا نالائق و ناہنجار کہ وہی غصّہ اور خفگی:۔

ممکن ہے کہ غلط ہو۔ مگر ہماری رائے یہ ہے میاں بیوی ہیں اَن بن
تو جب ہی سے شروع ہوئی۔ جب محمودہ تیسرے چالے کی دُلھن تھی۔ مگر پھوپی
کی شرم۔ پھوپا کا لحاظ۔ مجبوری معذوری کچھ بھی ہو۔ اتنا پھر بھی غنیمت تھا۔
کہ جھوٹوں سچوں تھوڑی بہت بیوی کی خاطر مدارات ہو جاتی تھی۔ مگر افسوس
محمودہ کچھ ایسی تقدیر کی بھونڈی نکلی کہ ابھی میاں اور ساس ہی کے جھڑکوں سے
نہ بچی تھی کہ نشان نہ گمان۔ بیمار نہ بیمار۔ خاصی بھلی چنگی۔ ایک دن
رات کو سوئی کی سوئی رہ گئی۔ ماں کی موت کا ایسا پہاڑ آکر گرا کہ کسی طرح
محمودہ کے سر کائے نہ سرکا۔ گو باپ موجود تھا۔ مگر ماں کی بات ماں کے
ساتھ تھی۔ اب کس کے دل کو لگتی تھی۔ جو اس کے دُکھ درد کو سُن کر بے چین
ہو جاتا۔ بہن بھائی۔ دادا نانی سب پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ ماں کیا مری
بس میکا ہی اُجڑ گیا۔ کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ چار دن بُلا کر مہمان رکھ لیتا:۔

بیوی کے چالیسویں سے فراغت پاتے ہی مرزا صاحب بھی بیت اللہ
سدھارے۔ والی وارث۔ دوست رفیق جو کچھ بھی تھے۔ میاں فذا کریا
اُن کی اماں وہ پہلے ہی موقعہ کے منتظر تھے۔ اب تو چوڑا میدان تھا۔ جو چاہتی
وہ کرتی۔ کرتی کیا۔ کیا اور ہانکے پکارے کیا۔ کنبہ میں ایک شادی ٹھہری۔

میل کے حکم کی تعمیل۔ ساس کی زبردستی۔ محمودہ کو بھی جانا پڑا۔ چار گھڑی دن ہوگا دو نو ساس بہوئیں ڈولی سے اُتریں۔ دستور قاعدہ کچھ نہ سہی۔ مناسب یہ تھا۔ گمانی بہو کو خاص خاص بیویوں سے ملاتیں۔ بھلا وہ غریب ناواقف۔ نیا گھر۔ نئے لوگ کہاں کہاں جاتی۔ کس کس سے ملتی۔ ہاں جو سامنے آیا سلام کرلیا۔ ساس اپنے ملنے جلنے۔ بات چیت میں رہیں۔ وہ چاروں طرف ڈھونڈ ڈھانڈ ایک کونے میں چپکی بیٹھ گئی۔ قسمت کی خوبی نوشتہ تقدیر۔ شاکرہ کی ملنے والی ایک بڑی بی ادھر اُدھر پھرتی پھراتی یہاں آنکلیں۔ اگلے زمانہ کی آدمی۔ دل میں محبت۔ آنکھ میں مروّت۔ محمودہ کی صورت دیکھتے ہی پھڑک گئیں گلے لگایا۔ چٹ چٹ بلائیں لیں۔ دیکھتی ہیں تو جیسے برسوں کی بیمار۔ رنگت زرد۔ طباق سا چہرہ سپید۔ کہنے لگیں "ہائیں بچی یہ کیا ہوا۔ آدھی بھی نہ رہی ایسا خدانخواستہ کیا غم پڑا۔ کہ گم سم چپ چاپ کونہ میں لگی بیٹھی ہے۔ یہ سب لڑکیاں بالیاں ہنس بول رہی ہیں۔ بیٹی۔ تو بھی اُٹھ مل جل:

محمودہ ۔ اماں جان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ خبر نہیں کدھر چلی گئیں:

بڑی بی۔ وُہ تو اس دالان میں ہیں۔ مگر یہ تو کہہ۔ یہ حالت کیا ہے؟ کچھ جی بے مزہ ہے؟"

محمودہ۔ جی نہیں۔ اچھی ہوں:

بڑی بی (ہنس کر) ہم نے تو اُسی وقت کہہ دیا تھا۔ ایسے کچے بچیوں میں خدا ہی ہے۔ جو لڑکی خوش رہے۔ مگر ہماری سنتا کون تھا؟

ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ یہ محمودہ کی تقدیر۔ بڑی بی بیچاری کو کیا خبر تھی کہ میری محبت اس کے حق میں زہر ہو جائے گی اور یہ میرا ہنسنا اُس کو مدتوں خون کے آنسو رُلوائے گا۔ پوری طرح کہنے بھی نہ پائی تھی کہ اُدھر سے

بی گمانی بھی آ پہنچیں۔ کھڑ پنچیوں کا نام سنتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بڑی بی کا کھسکنا تھا کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کیسے مہمان اور کس کا پرایا گھر بیگناہ بہو کی سینکڑوں بیبیوں میں ہزاروں فضیحتیاں کر ڈالیں۔ بہتیرا ہی سب نے سمجھایا قسمیں کھائیں کہ بہو بیچاری تو منہ سے بھی نہیں بولی۔ ہاں اتنا کہنے کی گنہگار ضرور ہے۔ کہ اماں جان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔" مگر گمانی جس کا نام تھا۔ وُہ کیا ماننے والی بنشرطی۔ وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ "ہاں ہاں اس نے اُن کے آگے میرا دُکھڑا رویا۔ الٰہی دشمن کی بیٹی کو بھی ایسی ساس سے پالا نہ پڑے" آدھی رات ہونے آئی مگر اس کم بخت کی جبنی ختم نہ ہوئی۔ کھانا پینا۔ اُٹھنا بیٹھنا چین آرام سب حرام کیا۔ زبان تھی؟ الامان! ایک قینچی تھی کہ برابر چلی جا رہی تھی محمودہ بیگناہ اسی کونہ میں دبکی سکڑی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا مُنہ سر لپیٹے بیٹھی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر طعنہ ایک سے ایک زیادہ کوسنا پڑ رہا تھا ؎

کھانے کا وقت آیا۔ خدا خدا کر کے بی گمانی دسترخوان پر گئیں تو اس بر تال سے چھٹکارا ہوا۔ خیر رات توجوں توں گذری۔ صبح اُٹھتے ہی ڈولیاں منگوائیں۔ بہو کو ساتھ لے گھر آئیں۔ ذاکر پہلے ہی بیوی سے ناخوش تھے۔ ماں کا آ کر لگانا ایک شتابا تھا۔ کہ بجھی بجھائی بارود میں رکھ دیا۔ غلطی بیوقوفی۔ گناہ۔ قصور سب سہی۔ پھر بھی بیوی تھی۔ گھر والی تھی۔ لونڈی نہیں باندی نہیں۔ ماما نہیں۔ زرخرید نہیں۔ ناہنجار غصے میں اندھا ہو۔ گھر سے نکالنے کھڑا ہو گیا ؎

اللہ اللہ کیسا دردانگیز وقت اور عبرتناک سماں تھا۔ وُہ آنکھ جس کی ماں باپ اِتنی احتیاط کرتے تھے کہ میلی تک نہ ہو۔ آج اس سے جل تھل

ندی نالے بہہ رہے تھے۔ جس کی حکومت کا میکے میں ڈنکا بج رہا تھا۔ آج بیگناہ چور بنی بیٹھی تھی۔ دن اسی جوتی بیزار میں ختم ہؤا اور نہین وقت کی بھوکی پر چوتھا وقت بھی صاف گذر گیا ؀

غیروں کی بیٹی ہوتی تو شاید یہ بھی کہہ سکتے۔ کہ گمانی مزاج سے ناواقف تھی۔ محمودہ چھوٹی سے بڑی بچی سے جوان۔ کنواری سے بیاہی۔ سب کچھ اس کے سامنے ہوئی۔ خوب جانتی تھی کہ اِس ضدن نے ذرا ذرا سی بات پر گھر بھر کو ناک چنے چبوائے ہیں۔ مگراب تو یہ یقین تھا کہ میاں پلّے پر۔ بیٹا کہنے میں جس بل نچاؤں گی۔ ناچے گی۔ گمانی اور ذاکر دونوں کو جانے دو۔ افسوس تو اس کا ہے۔ میر شریف مولوی۔ مفتی۔ عالم۔ فاضل۔ محمودہ۔ بہن کی بیٹی۔ مری ہوئی بہن کی بیٹی۔ سر بدلے کا سر۔ شاکرہ بدنصیب کی نشانی اور ایسے کٹر بے رحم۔ کہ بھانجی تو صورت دیکھ کر بلبلا اُٹھی۔ مگر کیا مجال جو ذرا دل پسیجا ہو۔ محمودہ مظلوم کو اگر کوئی آسرا۔ سہارا۔ اُمید۔ یقین باقی تھا۔ تو ماموں سے۔ سمجھی یہ تھی کہ بیوی کا ظلم۔ بیٹے کی زیادتی۔ میری بے گناہی۔ کچھ نہ کچھ حمایت لیویں ہی گے۔ میر صاحب کا گھر میں قدم رکھنا تھا۔ بالکل ہی بے اختیار ہو گئی۔ ضبط کیا۔ آنسو پونچھے۔ اُٹھی سلام کو آئی۔ ماموں کی صورت دیکھتے ہی ماں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ بہتیرا سنبھلی۔ مگر ناز پروردہ ستم رسیدہ کلیجہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ ماموں کا سر پر ہاتھ رکھنا تھا کہ بالکل ہی بے قابو ہو گئی۔ فاقہ۔ مصیبت۔ ضعف۔ نقاہت۔ ایک چیخ ماری اور یہ کہہ کر قدموں پر گر پڑی ؀

"ماموں جان۔ خدا گواہ ہے۔ میں بے قصور ہوں" ؀

چاہیئے کہ محمودہ کو اِس حالتِ زار پر میر شریف کو رحم آتا۔ لاحول ولا

قوۃ! بے گناہی کا اظہار گویا سانپ کی پھنکار تھی۔ سر پر سے ہاتھ اُٹھا۔ بھانجی کو چھوڑ منہ موڑ الگ جا کھڑا ہوا۔

کیسا نازک وقت ہوگا۔ بھانجی بے قصور۔ میاں اور ساس کی فریاد لیکر ماموں کے حضور میں کھڑی حسرت و یاس سے مُنہ تک رہی تھی اور ماموں جفاکار بھانجی کو جھوٹا مکار سمجھ بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ تم بتاؤ۔

ممانی - ہاں بوا ہاں۔ سچ ہے تم بے قصور نہ ہوگی تو کون ہوگا۔ سینکڑوں بیویوں میں ساس سسرے کی ناک کٹوائی۔ بے ایمان۔ کھچڑ پنچیا۔ ظالم۔ فرعون سب کچھ بنا دیا اور ابھی بے قصور رہی ہو؟"

سلطانہ - وہ تو یہی خدا کا شکر ہے کہ اماں جان نے اپنے کانوں سے سُن لیا۔ نہیں تو میرا ہی نام بدنام ہوتا کہ اس نے لگایا"۔

یقین تو کیا خاک آتا۔ مگر ضرورت یہ تھی کہ محمودہ ماموں کے منہ در منہ شروع سے آخر تک ساری رام کہانی کہہ سُناتی۔ لیکن شاکرہ جیسی ماں کی تربیت۔ تاتاری مغلوں کا جوہر شرافت کہاں غائب ہوجاتا؟ رگ رگ میں شرم و حیا۔ گھٹی میں ادب و تمیز۔ ناممکن تھا۔ کہ محمودہ سسرے کے سامنے ساس کو جھٹلا دیتی۔ صورت دیکھ کر چُپ ہوگئی۔

جھوٹوں کے بادشاہ ذاکر کے اس کہنے پر کہ "محمودہ نے اپنا گھر آپ کھویا" ایمان لائیں تو بی گمانی اور سلطانہ۔ میر شریف یا اُن کے مرید۔ وہ کون سی کوشش تھی میاں اور ساس کے دل میں گھر کرنے کی۔ جو اُس نے چھوڑدی؟ اور کیا کام تھا جو اس نے نہ کیا؟ بڑی سعادت مند بہوئیں دیکھیں۔ خود بی گمانی اپنے گریبان میں مُنہ ڈالیں۔ ان کی اپنی سگی بھتیجی جس کا سچ مچ ہی شربت کے پیالے پر نکاح ہوا۔ ساس سسروں کی بدولت وہ

راج رچا کہ باندھی بندھتی اور چھوڑی چھٹتی تھی۔ ایک اسی پر کیا منحصر ہے بیسیوں اللہ کی بندیاں نواب نصیر الدولہ بہادر کی بہو جس کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے۔ میکے سے چاندی کی بالیاں بھی نہ لائی۔ نیلے ڈورے اور کانچ کی چوڑیاں۔ مگر یہ کسی بہو کو دیکھا نہ سنا کہ ساس کے آگے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہو۔ ایک کسر تو البتہ رہ گئی۔ ورنہ محمودہ اور تو سب کر گئی۔ چلّے کی سردی۔ سانس کا مرض۔ بخار چڑھا ہوا۔ کم بخت کے گلے میں روئی کی نئی کمری بھی نہیں اور چار بجے سے اٹھ کر چولھا جھونکنا۔ شاکرہ جینی ہوتی تو اس کے دل سے پوچھتے۔ جس بچی کے وہ چولھے کے پاس تک جانے کی روادار نہ تھی۔ اس نے جیٹھ بیساکھ کی گرمی میں تین تین اور چار چار سیر بھر کونڈے آٹے کے پکائے اور تیوری پر بل نہ لائی۔ کیوں؟ فقط اس لئے کہ ساس مجھ پر مہربان ہو اور جب تک ساس قہرداں رہے گی۔ میاں اس سے زیادہ فرعون باسامان رہے گا ؎

(۳)

بڑوں کا مقولہ ٹھیک ہے۔ ماں باپ جنم کے ساتھی ہیں۔ کرم کے نہیں شاکرہ کو کیا خبر تھی کہ یہ شادی بچی کی عمر برباد کر دے گی اور یہ مرنے کو تیار بڑھیا پانچوں وقت کی نمازن۔ دو وقت کی حجن۔ بہو کی ایسی دشمن ہو جائے گی کہ توبہ بھلی۔ مان لیا کہ ذاکر حکم سے زیادہ مذہب کا پابند اور ضرورت سے بڑھ کر ماں کا تابعدار تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ جو لفظ زبان سے اپنے کان تک پہنچا۔ وُہ قرآن کی آیتیں تھیں۔ خواہ مخواہ کم بخت نے اسلام کو بدنام کیا۔ اپنی پوت اور کا ڈھینگڑا۔ مطلب نکلتا دیکھا تو اسلام کی آڑ پکڑ لی "ماں کا فرمانبردار ہوں" مگر بانی اسلام کا ارشاد کہ عورتوں کی عزت وہی

کرتے ہیں جو معقول ہیں اور تو ہیں وہ جو باجی" گویا سُنا ہی نہ تھا۔ ماں کی فرمانبرداری کو کون منع کرتا تھا؟ سر آنکھوں سے کرتا۔ دن کرتا۔ رات کرتا۔ لیکن یہ تابعداری تو گناہ اور گناہ بھی کبیرہ تھی کہ ایک بےگناہ کو جلا جلا کر اور سلگا سلگا کر پار اُتار دیا۔

اصل بات یہ تھی کہ مزاجوں میں اختلاف شروع ہی سے تھا۔ میاں چاہتے تھے۔ بیوی ساس سسروں کا لحاظ۔ دیور جیٹھ سب کی شرم پر خاک ڈال ہر وقت میرے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی رہے۔ بیوی کہتی تھی۔ شق ہو جائے زمین اور سما جاؤں میں۔ جو برس سوا برس کی بیاہی ساس سسروں کے سامنے میاں کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لوں۔ خود غرضی مطلب آشنائی یہ مرض تو میاں ذاکر ماں کے پیٹ سے لائے تھے۔ بیوی کی اتنی نافرمانی میاں کا مزاج درہم برہم کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔ اِس پر طرہ ماں کی لگائی بجھائی۔ بات کا بتنگڑا اور رہی کا بیل۔ مگر سوال یہ ہے وہ کیا چیز تھی جس نے لگائی کو بہو کا جانی دشمن بنا دیا؟ یہ سچ ہے مرنے کو مرنا سمجھتی تھی۔ تھوڑا بہت خوفِ خدا بھی تھا۔ لیکن مجبور اور لاچار تھی۔ نو اپنی عادات اور محبت سے۔ ایک بہو کیا اگر ہزار بہوئیں لاتی اور ایک منت خوشامد کیا۔ اگر بہو سر سے کنواں کھودتی تو وہ راضی ہونے والی عورت نہ تھی۔ لینا نہ دینا۔ مطلب نہ واسطہ کوئی کام ایسا نہ تھا۔ جس میں دخل نہ دیتی ہو اور کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں نہ بولتی تھی۔ کچھ مزاج ایسا واقع ہوا تھا کہ بلا سبب بے وجہ ہر وقت فضیحتی کرتی رہتی۔ یہ ذاکر کا کام تھا کہ ایسی ساس کے ہاتھوں جو بہو کے واسطے جیتے جی کا عذاب تھا۔ کسی طرح نجات دلاتا۔ مگر وہ تو دن بھر اسی شوق میں مست تھا کہ کسی طرح طرح دوسرا نکاح کر کے سنتِ رسول ادا کروں۔

آنکھوں کے اندھے۔ غرض کے بندے یہ ہیں۔ وُہ مسلمان جو اسلام کے قاتل۔ رسول کے دشمن۔ اصلی مطلب کو چٹ کر محض اپنی خواہشوں کے واسطے مذہب کو بدنام کر دیا۔ بڑا تعجب تو یہ ہے کہ ذاکر کے ہاں ایک آدھ نالائق ہوتا تو پھر بھی خیر۔ خرابی یہ تھی کہ کنبہ کا کنبہ بھونڈا۔ آوے کا آوا گندا + گمانی ہی کا ظلم ہوتا تو صبر آجاتا۔ افسوس اس کا ہے کہ مبر شریف اور ذاکر دونوں باپ بیٹے گمانی اور سلطانہ ماں بیٹیوں سے بھی بدتر نکلے ؛

کیسا صریح ظلم اور بے انصافی ہے۔ رمضان کا مہینہ۔ جاڑوں کے دن چار بجے کا وقت۔ گھر کی مالک ساس۔ بہو غریب آس نہ پاس۔ میاں نے حکم دیا۔ "قلمی بڑے بناؤ۔ ادھر ساس اُدھر بہو۔ بیچ میں سلطانہ سب ہی بیٹھے تھے۔ ذاکر کی آواز سب نے سُنی۔ فرمایش پوری کرتیں تو ماں جو گھر کی مالک و مختار۔ خرچ برچ کی ذمہ وار۔ بیوی تو "ہاں جی" کی تابعدار اور اتنی قصوروار تھی کہ جو ساس نے حکم دیا تعمیل کر دی۔ اتنی تو نہ ہمت تھی نہ اجازت۔ کہ کوٹھڑی میں گھس دال نکال بھگو دیتی۔ ہاں جتنا کر سکتی تھی۔ اُس میں کمی نہ کی۔ اُٹھی۔ ماما کو چپکے سے دو پیسے دئے کہ دال لاؤ۔ ماما اور بی گمانی کی ماما۔ اگر اس کا بس چلتا۔ تو محمودہ کو کچا ہی کھا جاتی۔ ناک بھوں چڑھا دونوں پیسے انگنائی میں پھینک کہنے لگی :۔

"بھلا بیوی تم نے موئے فقیروں کو بھی مات کیا۔ ٹکے ٹکے کی دال۔ نوج کسی گھر میں آئے۔ آخر یہ مٹکا بھرا پڑا ہے۔ نکالو تو کوئی ہاتھ تھوڑی پکڑے مگر ہاں یوں کہو۔ بیوی بیچاری کی تقدیر میں ہی بدنامی ہے۔ جتنا بھی کریں سب خاک۔ تم پیسہ ڈال الگ ہو گئیں۔ دیکھنے سننے والے تو یہی کہیں گے کیسی ظلمن ساس ہے۔ مٹکا بھرا دال گھر میں موجود۔ اور بہو کو اتنا حکم نہیں کہ

ہاتھ لگا ئیے - کیا کہوں - چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ دلہن بیگم - تم وہی اپنے ہاں کی قدر جانتی ہو - بنئیے کے ہاں سے سیر بھر آٹا آیا اور پک گیا - راجہ کے گھر آئی - رانی کہلائی - اب اِن باتوں کو چھوڑ دو - اللہ میرے میاں کی عمر دراز کرے - پیسوں کے دن گئے - اب روپوں کے سودے منگواؤ"۔

ساس تو یوں ہی بہو کے واسطے ننگی تلوار تھی - ماما کا اِتنا شرا کافی سے زیادہ تھا - دالان میں سے ایسی چیخ مار کر نکلیں - جیسے کفن پھاڑ کر مُردہ - مرے اور جیتے - اگلے اور پچھلے سب ہی اُکھاڑ پھینکے - روزے کے وقت باپ بیٹے آئے تو کیا دیکھتے ہیں - بی گمانی نے گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے - میر شریف تو روزہ کھول کھال بھاوجی پر بڑبڑاتے نماز کو چل دئیے - باپ کا باہر نکلنا تھا کہ ذاکر نے بیوی کو جھاڑنا شروع کیا - محمودہ جیسی بے زبان کو تو ساس ہی بہت تھیں - میاں نے اور مٹی پلید کی - گھر میں ماشاء اللہ آٹھ دس آدمی مگر کیا مجال جو کسی نے آکر اِتنا بھی پوچھا ہو - کہ محمودہ بدنصیب تو نے بھی روزہ کھولا یا نہیں - وہ جو سنتِ رسول ادا کرنے کی فکر میں تھا - جس سے دن بھر ٹھونسا اور افطار کے وقت وہی بڑے کی رکابی آگے رکھ ہٹا کٹا - موٹا تازہ پھلکیاں اُڑاتا جاتا تھا اور اس قبر کی مردہ روزہ دار کی فضیحتیاں کرتا جاتا تھا۔

یہ ہی نہیں کہ ماں بیٹوں پر معاملہ رفع دفع ہو گیا ہو - وہ چھوٹی سب سے کھوٹی سلطانہ - دو ہاتھ کا کلا - چار ہاتھ کی زبان - دالان ہی میں سے بیٹھی کلیجہ چھلنی کر رہی تھی۔

قبر تو شبّی ہی تھی - مگر یہ رات محمودہ پر مردے سے بھی بدتر گذری چپکے کا جاڑا - نیند پوری نہیں جیسے کا بچہ گود - جہیز کی میلی کچیلی رضائی اوڑھے

ٹھنڈی دری پر پتھر بنی بیٹھی تھی - آدھی - پچھلا - صبح سب اُسی پر ختم ہوا کھانسی
کی دھسک تو پہلے ہی تھی - کوڑھ میں کھاج - سردی میں پھاوٹ - صبح ہوتے
بڑا چھینٹا - اُوپر سے ہوا کا جھکڑ - چھلکا رضائی - دونوں ماں بیٹے - اندھیرے
آئی - باہر مٹکوں کے پانی سے کیا وضو - صحن میں پڑھی نماز - کپڑے برف - ہاتھ
پاؤں اَولا - بچے کو دیا دودھ - خدا معلوم کس قیامت کا تھا - پھر بن کر اُترا -
زہر ہو کر نکلا - پینا تھا کہ بدن سرد - سینہ جکڑا ہوا - بخار - بخار کے ساتھ ہی
سرسام - پہلونٹی کا بچہ - پہلا اتفاق - دھاروں رو رہی تھی - رفیق - غمخوار -
عزیز - صلاح کار - لے دے کر یہی دو میاں اور ساس یا بیچ کی بچولیا پیٹ
کی پھوٹو بی سلطانہ - محمودہ غریب یہ ہی کر سکتی تھی اور کیا - بچے کو کندھے سے
لگا ساس کے پاس آئی - ماتا کی ماری وہ جھگڑے ٹنٹے بھول بھلا رو کر کہنے
لگی - اماں جان! اس کو تو دیکھئے کیا ہوا؟ بہو پر تو خاک رحم آتا - مگر ہاں پوتے
کی محبت نے اتنا جوش کیا کہ جا نماز ہی پر بیٹھے بیٹھے گود میں لیا - چمکارا - پیار
کیا بچے کو دیکھتی ہیں تو بخار اس غضب کا کہ ہاتھ نہ رکھا جائے - سانپ کی طرح
سر دھن رہا ہے - اللہ غنی! کیا شتا عورت تھی - ندیدے گھر کا ملیدا - اللہ
امین کا لال - عمر بھر کی کمائی - میاں ذاکر کا ایک بچہ اور اس کا یہ حال - اس
وقت بھی نہ چوکی - چھوٹتے ہی کہنی کیا ہے "بیٹی - تمہارے چک چک لونڈوں
نے یہ کیا - خدا نہ کرے کسی بہو بیٹی کو زبان کا چٹخارا پڑے - بچوں کا پالنا
آسان نہیں - سارا جوبن گھالو - جب ایک لال پالو - موئے باسی - چاول
ٹھنڈی بریانی - دیکھ لو سرسام ہو گیا ؎

تین چار وقت کا فاقہ - چوبیس گھنٹے کی لتاڑ - منہ میں روزہ - دل پر
صدمہ - ساس کا منہ دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی - میاں اُٹھے سسرے

آئے۔ نند پہنچیں۔ کتنے معقول آدمی تھے۔ بچے کی پروا تو ایک کو نہ ہوئی۔ بچے والی کے سب سر ہو گئے۔ کچھ خدا ہی کو بہتری کرنی منظور تھی۔ ورنہ خیر نہیں۔ بدنصیب کی ناک چوٹی کٹتی۔ سر منڈتا۔ کیا ہوتا کیا نہ ہوتا۔ بھرے حکیم کی کالی گولی تھی تو معمولی۔ مگر تریاق کا کام کر گئی۔ فوراً قے ہوئی۔ رات بھر کا بچا ہوا ٹھنڈا دودھ پھٹے کے پھٹے اور تھکے کے تھکے گاڑھا گاڑھا نکلنا شروع ہوا۔ فساد سارا اِسی کا تھا۔ دوپہر تک تو البتہ ڈاک لگی رہی۔ پھر تو پیٹ دھویا دھایا صاف۔ کام تمام ہونے میں تو کچھ کسر تھی نہیں۔ خدا ہی نے محمودہ کی طرف دیکھ لیا۔ اُنیس بیس کا فرق تو دوپہر ہی کو ہو گیا تھا۔ ادھر ملی گھٹی! ادھر لگا لیپ بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ لڑکے کو تو خیر اچھا ہونا تھا۔ ہو گیا مگر افسوس اس کا ہے۔ سلطانہ اور گمانی دونوں ماں بیٹیاں صاف قسم کھا گئیں کہ ہم نے اپنی آنکھ سے بریانی کھاتے دیکھا۔

اس فتنہ پردازی کا محمودہ کو کچھ زیادہ صدمہ نہ ہوا۔ نہ اِس وجہ سے کہ بچہ بچ گیا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ کبھی کی میاں سے نا اُمید ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ساس نندیں جب تک میرا گھر نہ کھوالیں گی۔ چین سے نہ بیٹھیں گی۔ پھر بھی میاں کے سامنے اِتنا کہا۔ "مجھے تو بریانی کی صورت دیکھے ہوئے بھی مہینوں ہو گئے۔ مگر یقین کس کو آنا تھا۔ ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ میاں کو بیوی کے کمرے میں رکھنا قسم تھا۔ ذاکر۔ ذاکر کے ساتھ گمانی۔ گمانی کے ساتھ میر شریف۔ دو دو تین تین دن گذر جاتے اور کوئی جھوٹے موٹے بات نہ پوچھتا۔ صدقہ۔ خیرات۔ مجبوری۔ لاچاری۔ دو بجے اِدھر۔ گیارہ بجے اُدھر۔ تین چار روٹیاں۔ چمچہ بھر دال سالن لیا۔ اور بھجوا دیا۔ اُلفت محبت۔ شفقت۔ مروّت۔ سلطانہ کی اِتنی عنایت ضرور تھی۔ دن بھر طعن طنز

کرتی۔ ایسے کچوکے دیتی اور چٹکیاں لیتی کہ بسا اوقات محمودہ زندگی سے بیزار ہوکر موت کی دعائیں مانگنے لگتی۔ پہلے تو خیر اتنا بھی تھا کہ بھائی بھاوج کا لحاظ ماں باپ کا ڈر۔ چپ چپاتے کرتی اور دبی دبائی کہتی" اب وہ بھی جاتا رہا۔ بھائی کو ہوئی نفرت۔ اماں باوا ہوئے بیزار۔ دبلے اس کی جوتی۔ ڈرے اس کا صدقہ۔ کھلم کھلا کہتی۔ ہانکے پکارے کہتی ؎

اے جیوے میرا بھائی
گلی گلی بہو جائی

ذاکر کو تو دوسرے نکاح کا ارمان۔ آج کیا۔ چھ مہینے سے تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ ساس نندوں کی بدولت محمودہ پر سخت مصیبت آئی۔ مگر ہم سے پوچھو تو قصور سر سے پاؤں تک اسی ظالم کا ہے۔ گمانی اور سلطانہ پر کیا ٹھیکہ ہے۔ ساس نندیں تو چولوں کی بھی بُری۔ ذاکر کی طرح سب کی آنکھوں پر پردے پڑ جائیں تو بہوؤں کی اچھی طرح مٹی پلید ہوئی ؞

مطلع کا بندہ ہے۔ خود غرضی کا تھا بندہ۔ رگ رگ میں تن پروری بال بال میں بے حمیتی۔ بہن کی شہ۔ ماں کی حمایت۔ سونے پر سہاگہ یا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گئی۔ اس کا بس چلتا تو روز ایک نکاح کرتا۔ ڈر اور خوف تو کیا ہوگا۔ ایک ذرا سا کھٹکا میر شریف کا تھا۔ اس کو بی گمانی نے یوں دُور کیا۔ میاں کو شیشے میں اُتار بہو کو منہ در منہ کہہ دیا ؞

(۴)

"ارمان تھا کہ کسی طرح میرے جیتے جی ذاکر کا گھر بس جائے۔ تقدیر کی کیا خبر تھی کہ وہ بدنصیب اس مصیبت میں پھنس جائے گا۔ رات بھر پڑا روتا ہے۔ بہتیرا سوچتی ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں کیا نہ کروں

آدھا بھی تو نہیں رہا۔ کسی دن اس کی بین سنو۔ کلیجہ کٹتا ہے۔ ان بیوی کو سب طرح سمجھا ہاری۔ ان کی طرف سے جواب صاف ہے۔ اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں۔ آدھی آدھی رات اسی جھگڑے میں گذر جاتی ہے بلا سے اور کچھ نہیں تو اتنا تو کر جاؤں کہ بدقسمت کے پیٹ میں دونوں وقت پکی پکائی تو پڑ جایا کرے۔ یہ تو نہ ہو۔ دن بھر کا تھکا ہارا شام کو گھر آیا۔ تو چراغ بھی جلا نصیب نہیں؛

بے ایمانی ہو گی اگر یہ نہ بتایا جائے۔ گمانی لاکھ بہو کی دشمن۔ خون کی پیاسی سہی مگر دو بیٹوں کی ماں۔ بڑوں سے سنتی آئی:۔

"مت کر ساس برائی۔ تیرے بھی آگے جائی" یہ ارادہ اس کے دل میں نہیں ہوا کہ بیٹے کا دوسرا نکاح کر کے بہو پر سوکن لا بٹھاؤں۔ مگر خدا کی مار ایسی ممتا پر۔ اس ذاکر کم بخت کے کارن جو جو کچھ نہ کرنا تھا۔ سب ہی کچھ کر گئی۔ وہ تو نفس کا بندہ تھا۔ کوئی مرے یا جئے اس کی بلا سے۔ شاکرہ کی بھانجی۔ نصیرہ کی لڑکی امینہ ذہن میں تھی۔ سلطانہ کی معرفت ماں سے کہلوا دیا میری زندگی چاہو۔ تو جس طرح بھی ہو۔ نکاح کی سبیل ان کے ہاں کر دو؛

گمانی کیسی ہی بے رحم۔ کتنی ہی سنگ دل کیوں نہ ہو۔ پھر بھی جہاندیدہ عورت۔ زمانہ کا نشیب و فراز دیکھے برتے۔ خوب سمجھتی تھی۔ کہ نصیرہ کے ہاں پیغام دینا جوتیاں کھانا ہے گو کچہری عدالت ہوئی۔ آپس میں پھوٹ ہے مگر رتی بھر ناتا۔ گاڑی بھر آشنائی۔ ایسے کیا خون سفید ہو گئے۔ کہ نصیرہ محمودہ پر بیٹی دے دیگی۔ کچھ دن تو ٹالتی رہی۔ مگر ذاکر کی یہ کیفیت دیکھ کر۔ اندر آیا۔ اٹوائی کھٹوائی لے پڑ رہا۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ جھوٹا۔ مکار۔ رونا یا سونا بس یہی دو کام تھے۔ ماں کے بے حد اصرار۔ بہن کے بہت سر ہونے سے دسترخوان پہ بیٹھ گیا۔ دو چار نوالے کھائے۔

اور اُٹھ کھڑا ہوا - میر شریف اور بی گمانی دونوں میاں بیوی فاکر کی اِس حالت سے دل ہی دل میں سہمے جاتے تھے - اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا - اور یہ بھی کیا - کہ بی گمانی بیٹے کا پیغام لے کر نصیبہ کے ہاں گئیں ؛

یہ خبر ہم کو بھی ہے - کہ امینہ دو برس کی بیاہی رانڈ ہو چکی تھی - اور اب اس کو کنوارا لڑکا ملنا آسان بات نہ تھی - جوان جان اور پہاڑ سی زندگی کا کاٹنا - مصیبت کا سامنا تھا - برس سوا برس سے نصیبہ نے بہت ہی تلا توپ ڈالی - مگر بر نہ جڑنا تھا نہ جڑا - تاہم مُنہ پر آنکھیں بھی تھیں - تھوڑی بہت عقل بھی - دیکھ سکتی تھی کہ اس چیونٹیوں بھرے کباب اور سمجھ سکتی تھی - کہ اِس خانہ خراب سے جب محمودہ ہی جیسی بیٹی کو فلاح نہ ہوئی - تو کس کو ہو گی ؟ اور اگر ہوئی بھی - تو ایک اور وہ ایک بھی اپنا گود پیٹ - اس کو مصیبت میں ڈال - آپ خوش ہونا کس خدا نے بنایا ہے مگر وہ چلبلی تو اودھار ہی کھائے بیٹھی تھی - سنتے ہی سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا - جوڑے چڑھاوے کا فیصلہ ہوا - جھٹ تاریخ ٹھہر گئی ؛

مصیبت زدہ محمودہ ایسی بدنصیب نکلی اور کچھ ایسی منحوس گھڑی کی بیاہی گئی - کہ ایک دن بھی چین کا نہ گذرا - ساس نندوں کی زیادتی - میاں کا ظلم - سسرے کا غصّہ - پانچ چھ آدمیوں کے ستم - اور ایک اکیلا دم رات بھر اپنی تقدیر کو روتی - مگر کیا صبر کی بندی اور شکر کی بیٹی تھی کہ ایک حرف شکایت کا زبان پر نہ لاتی - دل میں درد اُٹھتا - کلیجہ میں ہوک اُٹھتی زور تھا تو آنکھوں پر روتی اور چپ ہو رہتی - دو ڈیڑھ سال ہی میں نصیب نے ایسا پلٹا کھایا کہ لالوں کی لال تھی - ایک وہ وقت تھا کہ گھنٹوں خوشامدیں ہوتیں - شاکرہ کھانے کے لئے پیچھے پیچھے پھرتی ا...

آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتی - ایک آج کا دن تھا کہ روکھی سوکھی چٹنی اُبالی سب امرت تھی - جو مِل گیا - نعمت سمجھا - شکر کیا اور کھا لیا - نوبت یہاں تک پہنچی کہ کپڑوں میں پیوند لگ گئے - دس دس پندرہ پندرہ دن سر دھوئے ہو جاتے اور ایک پیسہ کا تیل نصیب نہ ہوتا - پے در پے رنج اور متواتر صدمات نے مردہ بنا دیا - سوکھ کر کانٹا ہو گئی - آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے - جاڑے کا موسم بخار کی شدّت - کوئی پھٹی پُرانی رضائی مِل گئی - اوڑھ کر پڑ رہی - دو دو تین تین وقت صاف گذر جاتے - اور کھیل کا دانہ اُڑ کر مُنہ میں نہ جاتا - وُہ رات جس کی صبح کو ذاکر کا دوسرا نکاح تھا - آخر محمودہ بدنصیب کے سر پر آ پہنچی - آدھی رات تڑپ تڑپ کر گذاری - سوچتی تھی - کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا ؟ جو تھوڑا بہت سہارا تھا - وہ بھی آج ختم ہوتا ہے کیسے ہی ناراض - کتنے ہی فرنٹ تھے - پھر بھی میاں تھے - کبھی نہ کبھی تو میرا خیال آتا ہی + آج ساری امیدوں کو آگ لگ گئی - اب یہ کہاں اور میرا خیال کہاں ؟ ایک بجے کے قریب اُٹھی - وضو کیا - نماز پڑھی جانماز پر بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ باتیں کرنے لگی - خدا نہ کرے - ایسی بدنصیب کوئی ہو - جیسی میں - کسی کو دو چار ہی دن کا رنج صدمہ ہوتا ہے - میری ساری عمر ہی برباد ہوئی - الٰہ العالمین - آج مجھ بیگناہ کی حمایت لینے والا تیرے سوا کون ہے ؟ اماں جان کہانی میں کہتی تھیں " سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار " آج وُہ مثل مجھ پر اصل ہے رات کا سنسان وقت ہے - گھر بھر پڑا سوتا ہے اور یہ تیری لونڈی محمودہ تیرے دربار میں حاضر ہے - اے میرے پروردگار ! میری التجا قبول کر - میری فریاد سُن - میرا پردہ ڈھانک - مجھے موت دے + آنسو پہلے ہی زار و قطار بہہ رہے تھے - اِتنا کہتے ہی ہچکی بندھ گئی

ساتھ ہی خیال آیا کہ اگر میں مرگئی - تو اِس میرے لال کی مٹی کیسی ویران ہوگی؟ خبر نہیں کس کس کی جوتیاں اِس کی تقدیر میں ہیں - ماتما کا جوش - بھرا ہوا دِل - اُٹھی بچے کو گود میں لیا - پیار کیا - لپٹ گئی - اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر کہنے لگی " اے بے نیاز! مصیبت ماری کا بچہ کلیجہ کا ٹکڑا - آنکھوں کا تارا تیرے سپرد ہے - تجھ سے اچھا نگہبان - تجھ سے بہتر پالنے والا کون ہوگا؟ آہ زندگی کی کمائی - دنیا کا حاصل - عمر بھر کا اثاثہ - یہ ایک ننھی سی جان ہے جو تیرے سپرد کرتی ہوں تو ہی اِس کا وارث - تو ہی اِس کا مالک - میری نذر قبول کر - میری دُعا منظور فرما"۔

محمودہ بچے کو لے کر گڑ گڑا گڑ گڑا کر دُعا مانگ رہی تھی - کہ پھوپھی اور بی گمانی نے جوڑا چڑھاوا تیار کیا - پہلو میں دل - دل میں درد رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں - محمودہ بے گناہ پر کیا گذر رہی ہوگی - گم سُم اپنے کمرہ میں آ بیٹھی اور سوچنے لگی - اِس وقت خدا کے سوا کون ہے جو میری مدد کرے؟ اماں کی تو ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں - زندہ ہوتیں تو دیکھتیں کہ بھائی بھاوج کے ہاتھوں مجھ پر کیسی بپتا پڑی - ہائے کس کو بلاؤں؟ کس کو کہوں - کلیجہ اُمڈا چلا آتا ہے"۔

محمودہ یہ سوچ رہی تھی کہ ماما نے آ کر کہا " ذرا اپنے پتے اُتار دو " یہ وہ پتے تھے جو محمودہ کو ماں اور نانی دونو کی نشانی جان سے زیادہ پیارے تھے - نانی نے شاکرہ کو اور شاکرہ نے محمودہ کو دیئے - دل کے ٹکڑے پہلے ہی اُڑ رہے تھے - ماما نے اتنا کہہ کر کلیجہ ہی توڑ دیا - ماما کی صورت دیکھ کر چپ ہو گئی۔

کیسی بے کسی کا وقت تھا - پاؤں تلے کی چیونٹی بھی جان کی دشمن تھی ماما

اُنا حکم دے واپس چلی گئیں اور کہہ دیا "وہ نہیں دیتیں" ۔

ماما کا اتنا کہنا تھا کہ ذاکر میاں جھنجھلاتا ہوا اٹھا اور پھنپھناتا ہوا بیوی کے سر پر آ کر کہنے لگا ۔

"تیرے بدن میں کیوں آگ لگی ہے ۔ پتے کیوں نہیں دیتی ؟"

کیسی نیک کوکھ کی بیٹی تھی ۔ حسرت سے میاں کو دیکھا اور بالوں کی گونجیں کھولنی شروع کیں ۔

(۵)

کیا چیز ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ مصیبت ماریاں باوجود اس تنگی داماں کے بہت بڑی عزت و تعظیم کی مستحق ہیں ۔ وہ صرف ان کی خاندانی آن بان اور باپ دادا کی لاج ہے ۔ فاقہ ۔ فقر ۔ تنگی ۔ ترشی کچھ بھی ہو ۔ مگر یہ دکھیاریاں بڑوں کے نام کو ہاتھ سے نہیں دیتیں ۔ مرتے مر جائیں ۔ پیوندِ زمین ہو جائیں مگر یہ ممکن نہیں کہ بزرگوں کی عزت پر حرف آئے ۔ سچ پوچھو تو گدڑی میں لعل انسان کا یہ ہی فرقہ ہے ۔ ان بے زبانوں پر کتنا ہی ظلم ۔ کیسی ہی زیادتی کیوں نہ کرو ۔ ہر حال میں صابر ۔ ہر دکھ میں شاکر ۔ محمودہ لاکھ بے بس ہو ۔ پھر بھی انسان تھی ۔ مزاج میں تیہا ۔ طبیعت طبیعت میں غصہ ۔ سب ہی کچھ موجود تھا ۔ یقین ۔ اور یقین بھی کیسا کہ پورا پورا ۔ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ گھر چلا اور گھر کے ساتھ عمر برباد ہوئی ۔ سوکن کا خیال کلیجہ مسوس رہا تھا ۔ بڑی بات نہ تھی ۔ اگر میاں کے ایسے حکم کی تعمیل نہ کرتی ۔ مگر صد آفرین اس مظلومہ کو ۔ اوپر کی بالیاں اتار گھٹنے پر رکھیں ۔ لوگوں کی یہ سمجھ کر چھوڑ دیں کہ کان بالکل ہی ننگے ہو جائیں ۔ پھر خیال آیا ۔ کہ مجھ ننگی بچی کو اب دیکھنے پوچھنے والا کون بیٹھا ہے اتارنی تو ہیں ہی" کیسی جھجک ہٹ پٹ کی ۔ مگر نہیں ۔ آخر

میں بھی تو بیوی ہوں - برس سوا برس کی بیاہی - ایک بچّہ کی ماں - کچھ خیال تو کریں گے - بالیاں ہاتھ میں لیں اور سوچنے لگی - اماں نے اسی دن کو سینت سینت کر رکھی تھیں - کہ آج میں اپنے ہاتھ سے سوکن کو دے دوں؟ اُٹھی - میاں کے پاس آئی - ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے - رنگ سپید پڑا ہوا تھا - بھرائی ہوئی آواز سے جو اچھی طرح نکل بھی نہ سکی - منّت سے کہا - "دو کہو - تو لوگوں میں پہنے رہوں؟"

ذاکر جفا کار سے یہ توقع - کہ بیوی کی اس حالت کا اس کے دل پر کچھ اثر ہوتا محض غلط اور بالکل فضول - اس کو بیوی کے پاس اس وقت دم بھر کے لئے بھی کھڑا ہونا وبال اور ایک ایک لمحہ ایک ایک سال تھا - کم بخت نے بیوی کی تکلیف ذرا محسوس نہ کی اور رکھڑے کھڑے وہ بالیاں بھی اُتروا جھپٹ ہوا - میاں کے سامنے تو نہایت صبرو استقلال سے بالیاں دے دیں مگر اس کا بیٹھ موڑنا تھا کہ بالکل ہی دل ٹوٹنے لگا - کچھ دیر تک بیٹھی روتی رہی - پھر اُٹھی اور اُٹھ کر دروازے کے پاس آئی - جھانک کر دیکھا تو میاں دولھا بن چکا تھا - ساس کپڑے بدل چکی تھی - سلطانہ ہاتھ میں جوڑا لئے کھڑی تھی - سر مُنہ لپیٹ آ پڑی - سوچنے لگی - اب کیا کرنی - جو ہونا تھا وہ ہو گیا - جو دیکھنا تھا - وہ دیکھ چکی - مگر نہیں - ابھی تو بہت کچھ دیکھنا ہے - اللہ! کیسی پھوٹی تقدیر تھی کہ ساری عمر روتے ہی گذری! آہ میری ہی بالیاں - میرا ہی جوڑا - اور دیکھوں کیا کیا لکھا آگے آتا ہے - دُنیا مر رہی ہے - مجھ بدنصیب کو موت بھی نہیں - کہ کسی طرح اِن جھگڑوں سے چھوٹوں مصیبت کی کوئی حد - ظلم کی کوئی انتہا! کیسی بے غیرت زندگی ہے - ختم ہی نہیں ہو چکتی - بلا سے کچھ کھا ہی لوں کہ پاپ تو کٹے - مگر نہیں - خدا کو بھی مُنہ دکھانا ہے - یہاں تو خیر - جیسے گذرنی تھی -

گذری اور جیسی گذرنی ہوگی گذرے گی۔ میاں سے تو اچھی نہ بنی۔ اُس سے تو اچھی بنے۔ جس کا دربار سچا۔ جس کی سرکار اچھی۔ حرام موت مروں تو وہاں بھی عذاب بھگتوں۔ خیر۔ جو اس کی مرضی۔ جس طرح گذر رہی ہے۔ گذر جائے"۔

دوپہر تک اسی جھگڑے میں اُلجھی رہی۔ ظہر کا وقت آیا۔ نماز کو کھڑی ہوئی پڑھ چکی۔ سجدے میں گری۔ گرنا تھا کہ قادرِ مطلق کا دھیان آیا۔ اور دل نے صدا دی کہ اے بدنصیب۔ سوا اس ذات پاک کے اب تیری فریاد سُننے والا کوئی نہیں" روئی اور اتنا روئی کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ابھی سر نہیں اُٹھایا تھا کہ نئی دلھن کی سواری آ پہنچی۔ آگے آگے ذاکر شاداں و فرحاں۔ پیچھے پیچھے سلطانہ ہنستی کھِل کھِلاتی۔ دائیں طرف ساس۔ بائیں طرف بڑی نند۔ دلھن سمیت گھر میں داخل ہوا جس گھر میں اب سے دو گھنٹے پہلے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گہما گہمی ہو گئی۔ بڑھے منہ مہاسے۔ چلے لوگ تماشے۔ دنیا بھر کی رسمیں ادا ہوئیں۔ مشکل ہے کہ محمودہ کی حالت الفاظ میں بیان کی جائے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ دو دو چار چار لمحے کے بعد آ کر جھانکتی اور پھر آ بیٹھتی۔ عصر کا وقت آ گیا کہ بھائی بہنوں میں چپکے چپکے باتیں ہوئیں اور سلطانہ بھائی سے یہ کہتی ہوئی "لو ابھی لو" بھاوج کے پاس ہنستی ہوئی آئی اور کہا۔ "بھابی! تم اماں والے دالان میں چلی جاؤ۔ کمرہ خالی کردو"۔

(۶)

ایک اکیلی جان اور یہ دنیا بھر کے ظلم۔ کوئی دیکھنے والا ہوتا تو کلیجہ کھول کر دیکھتا کہ کیا گذر رہی ہے۔ مگر پڑی کس کو تھی۔ "جلے پرائی دھی او ہنسیں ٹاٹو لوگ" ساس نندوں سے لے کر لونڈی ماما تک سب ٹھٹھے مارتے پھرتے تھے

محمودہ کیسی ہی اُجڑی اُجڑائی پڑی ہو۔ پھر بھی گھڑی گھڑی اختر بختر بیبں جڑیں تھیں۔ ادھر حکم ادھر تقاضا۔ کیا کیا اُٹھاتی۔ کس کس کو سنبھالتی۔ سب چھوڑ چھاڑ دالان میں آبیٹھی ؎

دِنوں کو آتے جاتے کیا دیر لگتی ہے۔ بات کی بات میں پندرہ دن نکل گئے۔ شام کا وقت تھا۔ صبح کو عید۔ امینہ کے واسطے ذاکر سلمے ستارے کی سلیم شاہی ڈلاسی جوتی اور ڈوپٹے کے واسطے کاسنی کریب لایا۔ وقت یہ بھی کہ وقت تھوڑا اور کام بہت۔ تین پاٹ کا ڈوپٹہ سینا اور ٹانکنا کس کے بوتے کا تھا۔ اور کس کو غرض تھی جو اپنی نیند حرام کرتا۔ مغلانی تھی یا سوکن جو کچھ بھی تھی۔ لے دے کہ محمودہ۔ وہی سب کی نگاہ پر چڑھی۔ اُسی کو حکم ملا کہ راتوں رات تیار کردے ؎

زندگی سے بیزار تو کبھی کی تھی۔ سوکن کا آنا تھا کہ بالکل ہی جی چھوٹ گیا۔ اس پر یہ پندرہ دن تو ایسے گذرے کہ اندر ہی اندر کھولتی۔ دل تڑپتا۔ کلیجہ تلملاتا۔ ساری ساری رات انگاروں پر لوٹتی۔ بٹرلوں کی طرح پھرتی۔ پاگلوں کی طرح رہتی۔ امینہ کا آنا ایک ایسا زخم تھا۔ جو دل اور پھیپھڑا۔ تلی اور کلیجہ سب ہی کو لے بیٹھا۔ مواد کا اخراج ہوا نہیں۔ گھاؤ رہے لگنے۔ کیسا دل اور کہاں کا کلیجہ۔ بدن بھر پھوڑا تھا۔ کاسنی ڈوپٹے کا تیر ایسا آکر لگا کہ بالکل ہی آر پار ہو گیا۔ مگر ہائے بے بسی! جس طرح ہوا اور جس دل سے ہوا۔ کیا اور کرنا پڑا۔ گھر بھر پڑا سوتا تھا۔ اور وہ بدنصیب مظلوم بیٹھی ڈوپٹہ تیار کر رہی تھی۔ بارہ گھنٹے کی پہاڑسی رات صاف آنکھوں میں نکل گئی ٹانک بھی۔ ڈوپٹہ تہ کیا۔ اور سرہانے رکھ آئی ؎

امینہ گھنی مُنمُسی۔ گو بظاہر محمودہ سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ مگر یہ

کانٹا اس کے دل میں پہلے دن سے کھٹک رہا تھا - دن رات اِسی فکر میں غرقاب اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھی - کہ کسی طرح اس کا پاپ کٹے - مان لیا کہ زخم بھر چکا - آرام ہوگیا - مگر پھر بھی پُرانا ناسور ہے - ایسا نہ ہو - ہرا ہو جائے - اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں - ایسی غارت ہو - کہ پھر نام تک نہ سُنوں - میاں تو سوتے کا سوتا ہی رہا - ڈوپٹے پر تیل کی ڈبیا اوندھا آگے ہو بیٹھی - ماما بھیج سلطانہ کو بُلایا اور ڈوپٹہ پھینک کہنے لگی -

"لو لوا - یہ ڈوپٹہ تیل میں سڑ رہا ہے - تُو میں بس رہا - جلن تھی تو مجھ سے تھی - بھلا یہ کس خدا نے بتایا - کہ ڈوپٹہ اُٹھا غارت کر دیا - دیکھو تو سہی - تمام چک یہ چک ہے پچیس تیس روپے کا نقصان تقدیر میں ہونا تھا ہوگیا۔"

اگلے زمانے کی عورتیں یہ کہتی ہیں "ساس کلیجے کی پھانس سدا کھٹکے ہی جائے - نند بجلی بسنت سدا چمکے ہی جائے" اس سے بحث نہیں کہ صحیح کہتی ہیں یا غلط - مگر سلطانہ نے اس وقت تو بجلی کو بھی مات کیا - دوپٹہ ہاتھ میں لے ماں کے پاس آئی - اور دُور سے کھینچ مارا - کہ ماں بھی منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی - تیل کی بُو بھکر بھکر آرہی تھی - دالان بھی سڑ گیا - گمانی بیٹی کی اس حرکت پر جا نماز ہی پر بیٹھے بیٹھے جلنے بھلسنے لگی - تیوریاں چڑھائے کبھی ڈوپٹہ اُٹھاتی تھیں - کبھی بیٹی کو دیکھتی تھیں - جب کچھ سمجھ میں نہ آیا - تو بیٹی سے پوچھا "آخر یہ ہوا کیا؟"

سلطانہ - ہوا کیا - جیسا تم نے کیا - ویسی اس کی سزا ملی - تمہارا تو کچھ نہیں گیا - نقصان جس کا ہونا تھا - ہوگیا - کیسے شوق سے بچارے شاموں شام جا کر کپڑا لائے - تم نے اُٹھا کر اُن بیگم کو دیدیا - بھلا اُنہیں تاب کہاں تھی -

کمہار پہ تو بس نہ چلا - گدھیا کے کان اینٹھے - ڈوپٹے ہی کو جان سے کھویا۔ ٹُوکو - نہ مُوکو - لے چولھے میں جھونکو۔ بلا سے - مجھی کو دے دیتیں جس طرح ہوتا - اچھا بُرا کر کرا کے الگ کرتی - بڑا بہو کا سہاگ اچھلا تھا - پہلی عید برس کا برس دن - اب جہیز میں سے ڈوپٹہ نکال کر اڑھا دو - کٹ تو پہلے ہی چکی اور رہی سہی کٹ جائے گی"۔

محمودہ بیچاری کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ آفت ہے کیا - چبوترے پر بیٹھی بچے کا مُنہ دھلا رہی تھی - سلطانہ کی بنکار سُن کر اُدھر متوجہ ہوئی - تو رات بھر کی محنت اور نکان سب وصُول - بی گمانی کا تیہا - الٰہی تیری پناہ اس پر پچیس تیس روپے کا نقصان - ہوائیاں اُڑنے لگیں - اُدھر سے ذاکر بھی بہن کی آواز سُن کر آنکھیں ملتا ہوا آیا - ڈوپٹے کو دیکھتا ہے تو اوڑھنا کیسا ہاتھ لگانے کے لائق نہیں - سلطانہ - ذاکر - گمانی تینوں کے تینوں جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئے - محمودہ کے پاس لے دے کر اگر کچھ تھا - تو قسم - مگر وہ تو پہلے ہی جھوٹی مکار مشہور تھی - اس غریب کی بات سنتا کون تھا؟ ایک قرآن کیا - اگر پچاس قرآن اُٹھاتی تو وہ جھوٹی - اس کا باپ جھوٹا - کنجڑیوں کی زبان تو سُنی ہی تھی - گمانی اور سلطانہ نے اُن کو بھی مات کیا - دونوں ماں بیٹیوں کی آواز پرلے محلے پہنچ رہی تھی - ذاکر تھے کہ قطعی فیصلہ کر ماں سے کہہ گئے - "اب گھر میں یہ ہی رہے گی یا میں ہی رہونگا"۔

میر شریف تو کچھ دیر تک چپکے بیٹھے دیکھتے رہے - مگر دیکھا یہ - کہ جب تک بیٹے کی ضد پوری نہ ہو - نماز کو جانا حرام + اُٹھے - تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلے - پھر بھانجی یا بہو جو کچھ بھی تھی - اس کو حکم دیا - کہ "ابھی چھوٹے مکان میں چلی جاؤ"۔

محمودہ نے سوچی یہ تھی کہ صبح ہی بچے کا ہاتھ منہ دُھلا۔ اُجلے ثابت جیسے نکلیں کپڑے پہنا ساس کی گود میں دے آؤں گی۔ برس کا برس دن ہے۔ شاید کچھ مامتا کا جوش آجائے اور باپ بھی اس کو آنکھ بھر کر دیکھ لے۔ مگر بدنصیب کا سوچ بچار سب رکھا کا رکھا ہی رہ گیا۔ کپڑے بدلنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ منہ ہی دُھلا رہی تھی۔ کہ اِتنوں میں ایک اللہ کا بندہ نواب ان کی بولیگا سب سے نا اُمید ہوگئی۔ تو ماموں کی منتظر رہی۔ بچہ گود میں تھا۔ سامنے آئی اور کہنے لگی۔ یہ معصوم میری گود میں ہے اور میرا خدا دیکھ رہا ہے کہ تیل کے آس پاس بھی نہیں رکھا۔ بھانجی کی اِس قسم کا جواب یہ تھا کہ ابھی چھوٹے مکان میں چلی جاؤ"۔

خدا ایسی بپتا کسی پر نہ ڈالے۔ برس کا برس دن عید کا روز۔ دُنیا اپنے گھر کی جھاڑ بہار رہی تھی اور محمودہ بدنصیب کا گھر اُجڑ رہا تھا۔ کیسے شفق القلب لوگ تھے کہ مظلوم کی فریاد پر ایک کا دل نہ پسیجا اور کھڑے کھڑے نکال باہر کیا گھس لگانے کو آدمی نہیں۔ ادھی کوڑیاں پلے نہیں۔ بیٹے کو لے چھوٹے مکان میں چلی آئی۔ جل بھن کر دن گذارا۔ رو دھو کر رات کاٹی۔

اچھا ہوتا کہ محمودہ پر آسمان ٹوٹ پڑتا یا زمین نگل جاتی۔ کچھ ہی ہوتا مگر کسی طرح اِس مصیبت سے چھٹکارا ہوتا۔ بہتیرا روئی۔ ہر چند پیٹی۔ رو رو کر سجدے کئے۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دُعائیں مانگیں۔ مگر موت نہ آنی تھی۔ اور نہ آئی۔ تقدیر کا لکھا کسی طرح نہ ٹلا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ قرآن شریف آگے رکھ ڈوپٹہ پھیلا پھیلا کر کہتی "ارحم الراحمین۔ میری مشکل میں کام آ میرا پردہ ڈھانک۔ اے اللہ مصیبت کی کوئی حد۔ ظلم کی کوئی انتہا"۔

چاہیئے کہ محمودہ بدنصیب بے گھری بے دری کی طرف سے اب تو اطمینہ

چین سے بیٹھ جاتی۔ کچھ ایسی آگ پڑی تھی۔ کہ شب و روز یہی کوشش تھی اور یہی کام کسی طرح اِس کی آواز تو آواز نام تک نہ سُنوں۔ سلطانہ کے بچّے کا چھوٹا مُنہ دو دن کی ہوئی مہمانداری۔ دوسری رات گیارہ بارہ بجے تک تو ڈومنیاں گاتی رہیں۔ دو بجے کے قریب نیند میں تو سب غین ہو ہی رہے تھے۔ جس کو جہاں جگہ ملی۔ پڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ چار بجے ہونگے کہ دفعتہً امینہ اُٹھی چاروں طرف دیکھا۔ سلطانہ کے دالان میں آئی۔ بچے کا بھاری مصالحہ سے لپا ہُوا کُرتہ کھونٹی پر سے اُتارا۔ اپنے کمرے میں آئی۔ مصالحہ ادھیڑا۔ دیا سلائی جلائی اور کُرتے پر رکھ دی۔ ریشمین کُرتہ دم بھر میں بھر بھر ہو گیا ایک آستین باقی رہ گئی۔ جلا بُھلسا کُرتہ اُدھڑا اُدھڑا یا مصالحہ لے چھوٹے گھر میں پہنچی۔ اور محمودہ کی چھٹی پچی میں اڑس دیا۔ پانچ بج رہے تھے۔ پو پھٹ رہی تھی۔ موذن اذان دے رہا تھا۔ ادھر اذان ختم ہوئی۔ اُدھر امینہ اپنے کام سے فراغت پا اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔

سسرال کا آیا کرتہ ٹوپی اور وہ بھی اتنا بھاری۔ ساری گھر میں ڈھنڈیا پڑی۔ مگر ہو تو ملے۔ محمودہ کی مصیبت پر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں وُہ بے گناہ آس نہ پاس۔ اِتنی گنہگار تو ضرور تھی کہ لونڈیوں کی طرح آئی یا ماؤں کی طرح بیٹھی اور غیروں کی طرح اُٹھ کر چلدی۔ امینہ کم بخت نے بھرے مہمانوں میں کہہ دیا۔ کہ "آہٹ تو میں نے سُنی۔ چھوٹے گھر سے کوئی آیا اور پھر چلا گیا"۔

اتنا سنتے ہی سلطانہ۔ نصیرہ اور پانچ سات بیبیاں چھوٹے گھر پر جا ملیں۔ اڑسا ہوا کُرتہ الگ دکھائی دے رہا تھا۔ پچی کھولی۔ مصالحہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اب چور بننے میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی۔ جان پہچان اور انجان

سب ہی سب موجود تھے۔ بھرے مہمانوں میں عزت پر پانی پھر گیا ؛

کھانسی تو شروع ہی سے تھی۔ آٹھویں دسویں بخار بھی آجاتا تھا۔ مگر بے غیرت تھی وہ آپ اور بے حیا تھی اس کی زندگی کہ کسی طرح اس کا خاتمہ نہ ہوتا تھا۔ دو چار دن کو پڑی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چوری کا دھکا ایسا بیٹھا کہ پھر نہ پنپی۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گذر جاتے۔ کوئی لمحہ ایسا نہ جاتا کہ اِن مصیبتوں کے خیال پر آنسو نہ بہاتی ہو۔ جدھر نگاہ دوڑاتی تھی۔ سب جان کے دشمن نظر آتے تھے۔ کھڑی ہے تو تصویر ہے۔ بیٹھی ہے تو پتھر۔ لیٹی ہے تو ساکت۔ مہینوں گذر جاتے اور چہرے پر نام کو مسکراہٹ نہ آتی۔ کبھی بچہ ہمک کر گود میں آیا تو کلیجہ سے لگا ہنس لی۔ ورنہ وہ تھی اور نئی نئی مصیبتوں کا سامنا۔ امنگ اور ترنگ خواہش اور ارمان سب جا کر ایک موت کا انتظار باقی رہ گیا۔ ہجوم افکار۔ مہینوں کی بیمار مصیبتوں کی بھرمار۔ رفتہ رفتہ اِس قدر ضعیف و ناتواں ہوگئی کہ کھڑی ہوتی تو چکر آنے لگتے۔ ایک دن دوپہر کے وقت بخار میں ہل ہلا رہی تھی۔ بچہ پاس پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کچھ ماتا کا جوش۔ کچھ بخار کی گھبراہٹ۔ جھکڑ بندھنا شروع ہوا۔ سوچنے لگی۔ میری تو جیسی گذرنی تھی گذری۔ مگر میری وجہ سے اس معصوم کی مٹی کیسی پلید ہوئی۔ یہ پھول سا بچہ اور فاقوں پر فاقے۔ دودھ کا پتہ نہیں۔ کیا پلاؤں کیا چراؤں؟ میں تو اب بچتی نہیں۔ دو چار روز کی مہمان ہوں۔ یہ جی بچا تو بھولے بسرے قبر پر آکر فاتحہ تو پڑھ لیا کریگا مگر میرے پیچھے کس کو پڑی ہے جو اس کا خیال رکھے۔ اور اگر عمر ہی لے کر آیا۔ پل پلا لیا۔ تو اُٹھتے جوتی۔ بیٹھتے لات۔ اپنے منہ کے [illegible] دم ہے تو غلاموں سے بدتر بڈرا کر دے گی۔ نہیں نہیں۔ اب تو میں نہیں چاہتی

کہ آپ تو مر کر چھوٹ جاؤں اور اپنے اس چاند کو پھنسا جاؤں۔ مصیبت کا وقت
تو نکل گیا۔ اللہ میرے لعل کو پروان چڑھائے۔ اب تو میری بہار کے دن ہیں
میرا بچہ جئے۔ مجھے عیش کی کیا کمی۔ دس بارہ برس آنکھ بند کر کے نکل جائیں گے۔
میاں سے سکھ نہ پایا نہ سہی۔ ساری سوئیاں نکل گئیں۔ ایک آنکھوں کی اور
باقی ہیں۔ میں کیوں سدا ساس نندوں کی محتاج۔ میاں کی دست نگر رہنے
لگی۔ یہ کمائے گا۔ میں چین سے بیٹھی راج کروں گی۔ باتیں کرتے کرتے کچھ ایسا
جوش آیا کہ خاصے اچھے کھیلتے مالتے بچے کو کلیجے سے لگا زور سے بھینچنے اور کہنے
"میرا میاں میرا دولھا۔ میرا چندا۔ میرا پیارا بچہ"۔ ادھر تو بخار کی گرمی
ادھر ماں نے شروع کیا بھینچنا۔ گھبرا گیا اور لگا رونے۔ جلدی سے لٹا الگ ہو
ہو گئی۔ پیاس زور کی لگ رہی تھی۔ پانی کو اٹھی۔ کمزور تو پہلے ہی تھی۔ بخار تو
چڑھا ہوا۔ ہاتھ پاؤں بے قابو چبوترے پر پہنچی تھی کہ چکر آیا۔ بہتیرا سنبھلی۔ نہ
سنبھلا گیا۔ ستون پر گری اور کچھ ایسی بے کینڈے گری کہ لگ ماتھے پر گھس
گئی۔ ہر چند پوچھا اور دبایا مگر خون کی نکی کسی عنوان نہ تھمی۔ ڈھیر سارا جیتا
جیتا خون دم بھر میں نکل گیا۔ ہڈیوں کی مالا تو رہ ہی گئی تھی۔ جو کچھ تھوڑا بہت
خون باقی تھا۔ وہ یوں ختم ہوا۔ اٹھی تو اٹھنا مشکل۔ چلنا چاہا۔ تو چلا نہ گیا۔
کسی طرح گھسٹ گھسٹا اندر پہنچی۔ چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ
بھرتا پھرتا بھولا بھٹکا ادھر بھی نکل آئے۔ دو چار آوازیں بھی دیں۔ مگر
کس کی بکری۔ کون ڈالے دانہ گھاس۔ جس نے عمر بھر کے نباہ کا وعدہ
کیا تھا۔ وہی طوطے کی طرح دیدے بدل گیا۔ پھر ساس نندیں کیسی؟ اور
لونڈی ماما [illegible] پرواہ بھی نہ کی کہ کون چیخ رہا ہے اور کیوں
چیخ رہا ہے۔ خون بہا تو کچھ ایسا۔ کہ سارا منہ لہولہان ہو گیا۔ بخار میں

تو بھلس ہی رہی تھی۔ کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور بخار پر بخار چڑھا۔ سردی
کے مارے تمام ہاتھ پاؤں کانپنے اور بدن لرزنے لگا۔ دانت سے دانت
بج رہے تھے۔ پیاس کی یہ شدت کہ حلق اور تالو بالکل خشک اور ہونٹوں
پر پپڑیاں۔ زبان میں کانٹے۔ گرتی پڑتی۔ کانپتی۔ لرزتی مٹکوں تک پہنچی
چھپکوں سے دھویا منہ۔ ڈگڈگا کر پیا پانی۔ پینا تھا کہ بیری کی طرح کانپنے
لگی۔ لحاف رضائی اوّل تو ہوگی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو لانا اور اوڑھنا
بےکس کے بوتے کا تھا۔ دھوپ میں بیٹھی کپکپاتی رہی۔ غضب کا بخار۔ شدت
کی چوٹ۔ ستم کی سردی۔ دھوپ میں بیٹھنا قہر ہوگیا۔ بخار نے توہڈی ہڈی
پسلی پسلی توڑ ڈالی۔ بچّہ کچھ دیر تک اکیلا پڑا آغوں آغوں کرتا رہا۔ مگر اس
پھول کی بساط ہی کیا۔ لگا رونے اور چیخنے۔ لوٹتی پوٹتی۔ لڑکتی لڑھکاتی دالان
میں آئی۔ بچے کو آگے لٹا سوگئی۔ آنکھ کھلی تو جھٹپٹا وقت تھا۔ پسینے آرہے
تھے۔ بخار ہلکا ہوچکا تھا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو اندھیرا خاصا تھا۔ اُٹھی۔ دیاسلائی
کا بکس ڈھونڈ رہی تھی۔ دفعتہً بچّے کی تنہائی کا خیال آیا۔ دوڑ کر آئی اور
پاس بیٹھ گئی۔ کچھ وقت یوں بھی گذرا۔ خاصہ اچھا بڑا مکان۔ چاروں طرف
سناٹا اور اندھیرا گھپ۔ چور چکار کا کھٹکا۔ بھوت پلید کا اندیشہ۔ دِل
دَھڑک دھڑک کر رہا تھا۔ ذرا پتا کھڑکا اور جان نکلی۔ بچّے کو لے دیاسلائی
مانگنے کھڑکی میں آئی۔ پسینے میں شور بہ شور۔ انتظار میں لگی دیر۔ ہوا اثر کر
گئی۔ فالج تھا یا نزلہ۔ جو کچھ بھی ہو۔ بائیں طرف درد شروع ہوا۔ جوں توں
چراغ جلایا۔ گردے میں کسک معلوم ہوئی۔ سانس لیا تو لینا مشکل یقین
ہوگیا کہ اب موت سر پر آپہنچی۔ اور اِن تمام قضیوں کا خاتمہ کر دے گی۔ ساتھ
ہی خیال آیا کہ خاوند خوش نہ رہا۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کے ہاں پکڑی جاؤں۔ ایک

دفعہ سامنے آجائیں تو پاؤں پر گر کر قصور معاف کرالوں۔ مگر انہیں میری صورت دیکھنی قسم ہے۔ سانس کی تکلیف لحہ بہ لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ قلم دوات اُٹھا کر یہ پرچہ لکھا:۔

ناشاد و نامراد محمودہ کا آخری پرچہ غور سے پڑھنا۔ دُنیا کا سفر ختم ہوا۔ زندگی کے دن پورے کئے۔ بھلی بُری جیسی پڑی گذر گئی۔ مگر تمہاری ناخوشی کلیجے پر داغ ہے۔ یہ قبر تک ساتھ لے جاؤں گی۔ ارمان تھا کہ ایک دفعہ پاؤں پر گر کر قصور معاف کرالوں۔ لیکن چلنے کا وقت سر پر آگیا اور صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ آہ! بدنصیب تھی میں خود اور بے غیرت تھا میرا جینا۔ شرمسار رہی۔ گنہگار رہی۔ تم جیو۔ تمہاری عمر دراز ہو۔ عیش کرو۔ آرام کرو۔ میں کم بخت اسی قابل تھی کہ اس ڈھنڈار گھر میں تمہاری شکل کو ترستی رخصت ہو جاؤں۔ اماں کے گھر سے وداع ہو کر تمہارے ہاں آئی۔ آج تمہارے گھر سے بھی رخصت ہے۔ اب میں کہاں اور تم کہاں۔ آرزو تھی کہ تمہارے سامنے پیوند زمین ہوں۔ اپنے ہاتھ سے دفن کرو اور مٹی دو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ میری خواہش پوری ہوئی۔ میرا مطلب بر آیا۔ تکلیفوں سے بچی۔ مصیبتوں سے چھوٹی۔ البتہ یہ صدمہ ہے کہ تمہاری خدمت نہ کی اور تم کو رضامند نہ کر سکی۔ بڑا خطرناک سفر در پیش ہے۔ اور ایک زبردست شہنشاہ کے حضور میں جا رہی ہوں۔ میرے قصور کو معاف کرنا۔ کہیں تمہارے گناہ میں نہ پکڑی جاؤں چوری

کا شبہ میرے اوپر ایک بہتان تھا۔ خدا گواہ ہے میں بیگناہ ہوں۔ تقدیر کی خوبی تھی کہ اس تھوڑی سی زندگی میں چور۔ جھوٹی۔ لپاٹن سب ہی کچھ بن گئی۔ آہ! کلیجہ کٹتا ہے۔ جب خیال کرتی ہوں کہ بھرے مہانوں میں چور بنی ؞

خیر۔ ایک آخری درخواست ہے اور منت سے ہے اس مصیبت سے بھری زندگی کی یادگار میری امانت سمجھو یا نشانی۔ یہ کلیجہ کا ٹکڑا تمہارے سپرد ہے۔ دیکھنا۔ مصیبت ماری کا لعل ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ جی بچا تو شاید بھولے بھٹکے قبر پر آجائے۔ تمہارے طفیل ارواح خوش ہو جائیگی جو کانٹا کھٹک رہا تھا۔ وہ نکل گیا۔ میں چلی اور نامراد چلی فرصت ہو تو اپنے ہاتھ سے زمین کے سپرد کر دینا۔ دنیا کے معاملے یوں ہی رہیں گے۔ دن آئیں گے۔ راتیں جائیں گی۔ عیش ہوگا۔ آرام ہوگا۔ تم پھلو پھولو۔ چین کرو۔ سکھ سے رہو۔ چند روز میں میری ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو جائیں گی۔ اور لکھتی۔ منت کرتی۔ خوشامد کرتی۔ سامنے ہوتے ہاتھ جوڑتی۔ پیروں پڑتی سرخرو ہوتی۔ عزّت و آبرو سے رخصت ہوتی۔ مگر کیا کروں ہاتھ نہیں چلتا۔ میرے قصور معاف۔ میری خطاؤں سے درگذر۔ اچھا۔ اللہ حافظ" ؞

محمودہ اس خط کو ختم کر چکی تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے بچے کو گود میں لیا۔ حسرت سے دیکھا۔ جھکی اور جھک کر بچے کے مُنہ پر مُنہ رکھا۔ آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ کہنا چاہتی تھی

کر دفعتہً ایک ہچکی آئی۔ منہ پر منہ رہا۔ ہاتھ گلے میں رہا اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے ؞

مرکنٹائل پریس لاہور میں سید ممتاز علی اینڈ سنز پبلشرز ریلوے روڈ لاہور نے باہتمام
منشی الٰہی بخش پرنٹر چھپوائی